مولانا رومؒ اور اسلام کی تعبیرِ نو

MOWLANA RUM & REINTERPRETATION OF ISLAM

Dr. Ansar Madni
Dr. Fiza Muslim

Abstract:

Almighty Allah has made certain laws for the development and success of mankind.Without understanding and obeying these laws, no nation can even dream of well growth. According to divine laws of development, the process of boom and doom of any nation follows this pattern: Every nation who uses her resources in an optimum way in the leadership of some personalities among that the institutions start to emerge and make it impresses other nations. At the moment if intellectual elite doesn't plan for the future the downfall of that nation starts. In this short article, those contributions of Mowlana Rum are discussed those helped to enhance the capabilities of Muslims on the fronts of education, literature, religion, civilization, culture and ideology.

Key words*: Islam, Mowlana Rum, Reinterpretation, Civilization.*

کلیدی کلمات: اسلام، مولانا ر ، تعبیرِ نو، تہذیب۔

خلاصہ:

اللہ تعالٰی نے بنی نوعِ بشر کی ترقی و کمال کے خاص قوانین اور اسباب رکھے ہیں جنہیں سمجھے اور ان کی پیروی کیے بغیر کوئی قوم ترقی و کمال کا خواب نہیں دیکھ سکتی۔ خداوند تعالٰی کے بنائے ہوئے ترقی و تکامل کے قوانین کے مطابق قوموں کے عروج و زوال کی داستان یہ ہے کہ ہر قوم جب اپنی قیادت کی ہدایات کے مطابق اپنے خداداد وسائل کا استعمال کرتی ہے تو ترقی و تکامل کی منزلیں طے کرتی ہے۔ دوسری قومیں اس کی ترقی سے مرعوب ہوتی ہیں لیکن عین اسی لمحے اگر اس قوم کا دانشور اور صاحبِ رائے طبقہ اس قوم کی مزید پیشرفت کی منصوبہ بندی نہ کرے تو اسی مرحلہ پر اس قوم کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ مسلم امّت کے عروج و زوال کی داستان بھی ایسی ہی ہے۔ مسلم امّت کی ترقی و کمال کےلئے مولانا ر نے اسلام کی تعبیرِ نَو پیش کرتے ہوئے تعلیم، تہذیب اور ادبیات کے حوالے سے جو خدمات سرانجام دی ہیں، اِس مقالہ میں اس کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔

اقوام کی سرنوشت کے مراحل

معلوم تاریخ اور ماقبلِ تاریخ سے متعلق جو آثارملتے ہیں ان سے یہ بخوبی اندازہ لگایا جاسکتاہے کہ انسانی ترقی کے پیچھے جو اسباب کار فرما ہیں، ان کی تشخیص کیے بغیر کوئی بھی قوم ترقی کے خواب نہیں دیکھ سکتی ہے۔ کیونکہ یہ دنیاخدا کی بنائی ہوئی ہے۔اس میں رہنے اور ترقی کرنے کی ایک ہی صورت ہے کہ یہاں خدا کے بنائے ہوئے قوانین سے موافقت کرکے زندگی گزاری جائے۔ جو لوگ یہ رویہ اختیار کرتے ہیں، وہ کامیابی حاصل کرتے ہیں اور جو لوگ ایسانہکریں وہ بربادی کا شکار ہوجاتے ہیں۔ قوموں کے بارے میں خدا کے بنائے ہوئے عروج وزوال کے قانون کی بھی یہی حیثیت ہے۔ یہ توممکن نہیں کہ کسی قوم کو اس قانون سے استثنا مل جائے، مگر جو قومیں اس قانون اور اس کے پس پردہ کام کرنے والے اسباب وعلل کو سمجھ لیتی ہیں، وہ عروج کی منزلیں جلد طے کرتی ہیں۔ ان کے اقبال کا زمانہ طویل اور زوال کا دورممکنہ حدتک دور ہوجاتا ہے''۔[1] بہرصور، ہرقوم اپنی تشکیل، ترقی اور تنزلی میں کچھ مراحل طے کرتی ہے۔ ذیل میں ان مراحل کو بیان کیا گیا ہے۔

1. **تشکیل کا مرحلہ:** یعنی منتشرافراد میں ایک ایسی سوچ کو اجاگر کرنا، جس کی بدولت وہ ایک دوسرے کے قریب آسکیں اور اقوامِ عالم میں اپنی ایک انفرادی حیثیت بنانے میں کامیاب ہوجائیں۔
2. **شناخت کا مرحلہ:** جب کسی قوم کی اجتماعی سوچ نمایاں ہوجاتی ہے تو پھراس کی شناخت کا مرحلہ آتاہے۔ یعنی قوم میں سے ایسے افراد سامنے آتے ہیں جو قوم کی صحیح معنوں میں رہنمائی کرتے ہیں۔ اچھائی اور برائی میں تمیز، نقصان اور فائدہ مند چیزوں کی نشاندہی کرکے قوم کو ایک متفقہ نقطہ پر مجتمع کرتے ہیں۔
3. **استحکام کا مرحلہ:** یعنی اس مرحلے میں قوم کے افراد کو وسائل سے استفادہ کرنے کا موقع ملتا ہے اور قومی سطح پر ایسے ادارے وجود میں آنا شروع ہوتے ہیں جن سے براہِ راست قوم فائدہ اٹھاتی ہے۔
4. **کمال کا مرحلہ:** جب کوئی قوم کمال کی منزل پر پہنچ جاتی ہے تو دوسری اقوام اس کے طرزِ زندگی سے نہ صرف متاثر ہوتی ہیں بلکہ وہ اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے اپناسرتسلیمِ خم کرلیتی ہیں۔
5. **انحطاط کا مرحلہ:** دورِ عروج میں اگر قوم کے سنجیدہ افراد آنے والے حالات کے لئے مناسب پیش بندی نہ کریں اور عیش وعشرت اور غروروتکبر میں مبتلا ہوجائیں تو پھر اس قوم پر انحطاط کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے یعنی قومی سطح پر شخصیات کے بننے کا عمل رک جاتا ہے اور ایک لحاظ سے قحط الرجال کا مسئلہ درپیش ہوتاہے۔ اور قوم غیرمحسوس انداز میں زوال کی طرف بڑھتی ہے۔
6. **زوال کا مرحلہ:**دورِ انحطاط میں چونکہ قوم عیش وعشرت کی زندگی میں کھوکر افرادکی بے پناہ صلاحیتوں کو ضائع کرچکی ہوتی ہے اور قوم کی رہنمائی کرنے والے افراد کا ظہور مکمل طور پر بند ہوچکا ہوتا ہے، اس لئے منزل زوال میں قومی سطح پر جو ادارے کام کررہے ہوتے ہیں وہ باصلاحیت افراد کی عدم دستیابی کی وجہ سے تباہی کا شکار ہوتے ہیں۔ اس دورمیں اندرونی خلفشار اور بیرونی خطرات کی صورت میں قوم تباہی کا سامنا کررہی ہوتی ہے۔
7. **تباہی کا مرحلہ:**زوال کی مدت چاہے جتنی بھی طویل ہومگر تباہی اس قوم کے مقدر میں ہوتی ہے اور وہ بہت جلد اقوامِ عالم میں اپنی شناخت کھودیتی ہے۔

اقوام کی تباہی کے اسباب

یہاں اس بات کا خیال رکھا جائے کہ افراد کا وہ مجموعہ جو قومی سطح پر اپنی بہترین صلاحیتوں کی اظہار کی بدولت کوئی مقام پاتا ہے۔مجموعی طور پر اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا حصہ علمی وفکری بنیادوں پر کام کرنے والے افراد پر مشتمل ہوگا۔ جب کہ دوسرا حصہ ظاہری اور مادی بنیادوں پر کام کرنے والے افراد پر مشتمل ہوگا۔ اس لحاظ سے جب کسی قوم کی تکمیل یا عروج کا زمانہ ختم ہوجائے اور وہ زوال وتباہی کی طرف بڑھے تو مذکورہ دونوں حصے متاثرہوتے ہیں اور اس کی بنیادی طور پر چار اسباب ہوسکتے ہیں۔

سببِ اول: قومی سطح پر جن متفقہ اصولوں کو وضع اور متعین کیا گیا تھا ان کی سماجی اور اقتصادی قدروں کو فروغ دینے اور اصلاحات نافذ کرنے میں مجرمانہ کوتاہی کی گئی ہو۔

سببِ دوّم:پیشوائی اور رہنمائی کے منصب پر ایسے افراد جلوہ افروز ہوجائیں جو اپنے فرائض کو نہ صرف فراموش کریں بلکہ وقتی منفعت کی خاطر حقیقی مسائل سے چشم پوشی کریں۔

سببِ سوّم:حکمراں طبقہ مالی بدعنوانی کا شکار ہوجائے اور اقرباء پروری کی روش اپنائے۔

سببِ چہارم: حکمران طبقہ اپنے اقتدار کو دوام دینے کے لئے ہرقسم کے حربے کو استعمال کرنا جائز سمجھیں۔ جب ہم درج بالا نقاط کی روشنی میں مولانا رومؒ کے عہد کا جائزہ لیتے ہیں تو مولانا رومؒ کی حیات وخدمات پر کام کرنے والے محققین کا یہ خیال ہے کہ: ''رومی ۱۲۰۷ء میں پیدا ہوئے اور ۱۲۷۳ء میں انہوں نے وفات پائی۔ یہ دور مسلمانوں کے لئے انتہائی ذلت اور زوال کا دور ہے جب انہیں دومختلف قسم کے دشمنوں سے سابقہ پڑا۔ ایک طرف صلیبی جنگوں کا آغاز ہو چکا تھا جن کے باعث فلسطین اور اردگرد کے علاقے یورپ کے وحشی فوجیوں کے ہاتھوں بری طرح پائمال ہورہے تھے۔ دوسری طرف منگولوں کے ظالمانہ حملوں سے ہرطرف تباہی اور مکمل بربادی کا خوفناک منظر آنکھوں کے سامنے عبرت کا سماں پیش کررہاتھا۔ چنگیزخاں نے ۱۲۱۹ء میں ان حملوں کا آغاز کیا جس سے مسلمانوں کے اکثر ملک تباہ وبربادہوگئے اور پھر ۱۲۵۶ء میں ہلاکوخاں کے ہاتھوں دوسری بار تباہی کا آغاز ہوا جس کے باعث ۱۲۵۸ء میں خلافت بغداد ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی۔ تیسری طرف ہسپانیہ میں بھی مسلمانوں کی عظیم سلطنت ۱۲۶۶ء میں ختم ہوگئی''۔[2]

اس اعتبار سے مولانا رومؒ کل ۶۶سال کی عمرشریف پاتے ہیں اس عرصے میں آپ نے مسلمانوں پربیرونی جارحیت کے بدترین مناظر کا مشاہدہ کرتے ہیں۔یعنی چنگیزخان اورہلاکوخان کی درندگی، قتل وغارت اور مسلمانوں کی نسل کشی توایک طرف مگر صلیبی جنگوں کا تسلسل ہنوز جاری تھا یعنی ''۱۰۹۵ء بمطابق ۴۴۴ھ کو عیسائیوں نے بیت المقدس فتح کرلیا اور اس قدر خونریزی کی کہ ساٹھ ہزار کی آبادی والے شہرکو پورا کا پورا تہہ تیغ کرڈالا۔ بیت المقدس کے صحن میں خون کا دریا بہنے لگا۔ اس طرح قبلہ اول مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس کے بعد اگلے کئی سوسال مسلمانوں اور عیسائیوں میں مستقل لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا''۔[3] اس کا مطلب یہ ہوا کہ مولانا رومؒ کا یہ عہدنہ صرف مسلمانوں کے لئے بیرونی جارحیت کا بدترین عہدتھا، بلکہ اندرونی طورپر بھی مسلمان خلفشار کا شکار تھے۔''رومی کے زمانے میں مُلّا ظاہر پرست رہ گیا تھا اور فقیہ دفتر پرست۔ یہ گروہ دین کے مغز کو چھوڑ کر ہڈیاں چبارہے تھے بلکہ ان ہڈیوں پرایک دوسرے سے لڑرہے تھے۔ اسی صورت حال کے متعلق مولانا روم کا یہ مشہور شعرہے:

من زقرآں برگزیدم مغز را استخواں پیش سگاں انداختم [4]

یعنی مولاناروؒ نے اہلِ دانش کی توجہات اس اہم مسئلہ کی طرف مبذول کرانے کی بھرپور کوشش کیں کہ دین اسلام کی جو اصل روح ہے اس کو اقوامِ عالم کے سامنے پیش کریں اور آپس کی سطحی اور فروعی اختلافات کو ہوا نہ دیں۔اس طرح کے طرزِعمل سے اسلامی تعلیمات کی نشرواشاعت کا سلسلہ محدود ہوکر رہے گا۔ اور مسلمانوں کی اجتماعی وحدت کو شدید نقصان پہنچے گا۔ مگر آپؒ کی اس فکر کو اُس دور میں اہمیت نہیں دی گئی اور ''مسلمانوں کی تاریخ باہمی جنگوں اور آپس کی فتوحات اور شکستوں سے لبریزہے۔ کبھی ایک خاندان برسر اقتدار آتا اور کبھی دوسرا، لیکن ان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ ایک غیرمسلم قوم نے مسلمانوں کو شکست دی اور شکست بھی ایسی جس سے ان کے ذہن اور جسم دونوں مضمحل ہوکررہ گئے۔ لازماً سوچنے والے ذہنوں میں یہ سوال ابھرا کہ کیادین اسلام میں وہ صلاحیت موجود ہے جو وہ آج تک اس سے منسوب کرتے چلے آرہے تھے؟ کیا وہ عقلی طور پر انسانوں کے لئے قابلِ قبول ہے؟ کیا وہ محض اَن پڑھوں، بدوؤں اور صرف عربوں کا دین ہے یا متمدن لوگوں کے لئے بھی اس کے پاس کچھ ہے؟ غرض اس دور کے مسلمان اسلام کی حیات بخش اور حیات پرور تعلیم سے مایوس ہورہے تھے۔ ان کے سامنے اسلام کا شاندار ماضی ضرور تھا، لیکن اس کا حال بالکل تباہ حال تھا اور مستقبل میں کوئی امید کی کرن نظر نہ آتی تھی۔ اس ذہنی مایوسی اور علمی کم مائیگی کے دور میں رومی نے اسلام کی نئی تعبیر پیش کی، جس میں ایک طرف اس وقت تک کی تمام علمی فتوحات کی مدد سے اسلام کا ایک ایسا خاکہ پیش کیا جو ذہنوں کو مطمئن کرسکے اور دوسری طرف ان لوگوں کے قلب کو گرما سکے جو زندگی کے اس مایوس کن ماحول میں جرأت مندانہ قدم اٹھانے کو تیارتھے''۔[5]

فاضل مقالہ نگار نے مسلمانوں کے جن اندرونی مسائل کی طرف اشارہ کیاہے اور مسلمان بحیثیت قوم جس مایوسی اور ذہنی انتشار اور طرح طرح کے وسوسوں میں مبتلاتھی۔ مولانا رومؒ نے حالات حاضرہ کا باریک بینی سے مطالعہ کرتے ہوئے اس قوم کو مایوسی اور ناامیدی سے نکالنے کی یقیناً بھرپور جدوجہد کی۔ اور اسلام کی تعبیرِ نو کے سلسلہ میں جن زاویوں کو منتخب کیا ان میں سے ایک تصوفانہ روش اختیار کرنا بھی ہے۔ علامہ شبلی نعمانی اس بات کی یوں وضاحت کرتے ہیں:"صوفیانہ شاعری کی ترقی کے بہت سے اسباب پیدا ہوگئے، تاتاریوں کے ہنگامہ نے جو اسی زمانہ میں شروع ہوا تمام اسلامی دنیا کو زیروزبر کردیا۔ اینٹ سے اینٹ بج گئی، مشرق سے مغرب تک سناٹا ہوگیا۔ تصوف کی بنیاد دنیا و مافیہا کی بے قدری اور بے حقیقتی ہے، یہ سب کو آنکھوں سے نظر آگئی، اس حالت میں جو دل متاثر اور قابل تھے، ان کو خداسے زیادہ لولگی، انابت، خصوع، تضرع، رضابالقضاء، توکل جو تصوف کے خاص مقامات ہیں خودبخود دل پر طاری ہوئے اسی کا نتیجہ ہے کہ جس کثرت سے صوفی شعراء اس زمانہ میں پیدا ہوئے کسی زمانہ میں نہیں پیداہوئے، مولانا روم، سعدی، اوحدی، عراقی سب انہیں اسباب کے نتائج ہیں۔

صوفیانہ شاعری کی ترقی کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ تصوف میں ابتدا ہی سے اخلاق کے مسائل شامل ہوگئے تھے، کیونکہ اخلاق کو تصوف سے ایک خاص تعلق ہے، اخلاق کا فن اس زمانہ میں نہایت وسیع ہوگیا تھا۔ احیاء العلوم نے اس فن کے دقیق اسرار عام کرلئے تھے، محقق طوسؒ نے اخلاق ناصری میں ارسطوکے فلسفیانہ اخلاق ادا کیے اس کے اثر سے شاعری میں اخلاق کا ایک سرمایہ مہیّا ہوگیا اور یہ سب تصوف کے حصہ میں آیا، چھٹی صدی میں فلسفہ کو عام رواج ہوا، اور مذہبی گروہ میں بھی فلسفہ کی کتابیں درس میں داخل ہوگئیں، چنانچہ اس دور کے جس قدر مذہبی علماء ہیں، فلسفہ سے بھی آشنا ہیں، صوفیہ کے گروہ میں مولانا روم اور شیخ محی الدین اکبر فلسفہ کے پورے ماہر تھے، اس لئے خود بخود ان کی تصنیفات میں فلسفہ کا امتزاج ہوگیا، تصوف کے بہت سے مسائل ایسے ہیں جن کی سرحد فلسفہ سے ملتی ہے، مثلاً وجودِ باری، وحدت الوجود، جبرواختیار، حقیقتِ روح وغیرہ، اس لئے ان مسائل میں فلسفہ کا اثر آنا ضرور تھا، غرض اب تصوف اور صوفیانہ شاعری اسی طرح فلسفہ سے ممزوج ہوگئی جس طرح اس زمانہ کا علم کلام، طبیعیات اور فلکیات کے مسائل سے مملوہے ان اسباب سے صوفیانہ شاعری زیادہ وسیع اور زیادہ دقیق اور عمیق ہوگئی، اس عہد کے مشہور صوفی شعراء میں عراقی، سعدی اور مولانا روم ہیں۔ [6] اس کا مطلب یہ ہواکہ مولاناروم نے اپنے عہد کی ان تمام فکری اور علمی پیچیدگیوں کو نہ صرف آسان زبان میں سلجھانے کی کوشش کیں،بلکہ پوری ذمہ داری کے ساتھ ان مسائل کا حل پیش کیا۔ مثلاً:

1) مولانا رومؒ نے بانسری کے بیان سے روح کی ماہیت اور اس کے جذبات کو دل نشین اور دل سوز انداز میں پیش کیااور یہ ثابت کیا کہ روح چونکہ اپنی اصل سے جدا ہوچکی ہے اور اسے بہرحال اپنی اصل کی طرف لوٹناہے یعنی ''یاایتھاالنفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ'' کی منتظرہے۔ اور کس خوبصورتی کے ساتھ نہ صرف روح کی اضطرابی حالت کو بیان کیاہے بلکہ اس معاملہ میں مختلف ادیان و مذاہب کی تحریفی روش کو اجاگرکیاہے۔
2) وحدت الوجود کے مسئلہ پر صوفیاکے خلاف جو تحریک چلی اور اس کے نتیجہ میں علماء کو وحدت الشہود کا نظریہ پیش کرنا پڑا۔ یعنی'' وحدت الوجود اور وحدت الشہود دونوں فلسفے ذاتِ باری تعالیٰ اور مخلوقات وممکنات کے تعلقات کو بیان کرتے ہیں اور ان دونوں فلسفوں کو توحیدِ عینی اور توحیدِ ظلّی سے بھی تعبیر کرسکتے ہیں''۔[7] مولانا رومؒ اس ضمن میں جہدوجہد اور سعی وعمل کے بہت بڑے داعی تھے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو ہاتھ پاؤں دیئے ہیں۔ تاکہ وہ کوشش کرے اگر وہ ایسا نہیں کرتا ہے تو کفرانِ نعمت کرتا ہے۔ اسی طرح مولاناؒ فرماتے ہیں:

رمزالکاسب حبیب اللہ شنو ازتوکل درسبب کاہل مشو

کمانے والااللہ کا دوست ہے کااشارہ سن توکل کی وجہ سے اسباب اختیار کرنے میں سستی نہ کر

درتوکل کسب وجہداولیٰ ترست تاحبیبِ حق شوی این بہترست

کمانا اور کوشش کرنا توکل کے معاملہ میں بہت بہترہے۔ تاکہ تو اللہ کا سہارا بن جائے یہ اچھا ہے۔[8]

3) جبروقدر کے سلسلے میں گروہِ جبریہ، گروہِ قدریہ، اور اشاعرہ کے نظریات بہرحال تاریخ کے دامن میں محفوظ ہیں۔ جبر و اختیار کے سلسلے میں مولاناؒ فرماتے ہیں:

I. ''ہر شخص کے دل میں اختیار کا یقین ہے گوزبانی اس کا انکار کرے اگر اسی شخص کے سرپر چھت ٹوٹ پڑے تو کبھی چھت پر غصہ نہ کرے گا اور اگر کوئی دوسرا شخص اس کے سرپر پتھر ماردے تو اس پر اس کو سخت غصہ آئے گا اور یہ اسی بنیاد پر ہے کہ چھت کو اس نے غیر مختار سمجھاہے اور اس شخص کو اس نے صاحبِ اختیار ماناہے''۔

II. ''خود انسان کے تمام اقوال وافعال سے اختیار کا ثبوت ہوتا ہے۔ ہم کسی شخص کو کسی کام کے کرنے کا حکم دیتے ہیں، کسی کو کسی کام کے کرنے کی ممانعت کرتے ہیں۔ اپنے کسی فعل پر خود نادم ہوتے ہیں اور کسی فعل پر خوش، یہ اس کی دلیل ہے کہ ہم خود آپ کو اور دوسرے کو صاحبِ اختیار سمجھتے ہیں''۔

III. ''جبرکے ثبوت میں سب سے بڑی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ اگر خدا ہمارے افعال پر قادر نہیں ہے تو مجبور ہے اور اگر قادرہے اور بندہ کو بھی قادر مانا جائے تو ایک فعل کے دو فاعل قرار پاتے ہیں جو باطل ہے۔ مولانا نے اس شبہ کا جواب دیا جو شبہ کا جواب بھی ہے اور بجائے خود بندہ کے اختیار کے لئے دلیل بھی ہے۔ فرمایا جو چیز کسی چیز کی ذاتیات میں سے ہے وہ سلب نہیں ہوتی ہے۔ لوہار کے بسولے میں جبرہے لوہار کا آلہ بننے کی وجہ سے۔ اس کا جبرسلب نہیں ہوجاتا ہے۔ اسی طرح اختیار انسان کی ذاتیات میں سے ہے۔ اگر اللہ کو فاعل مانا جائے اور انسان اس کے لئے بمنزلہ آلہ کے ہوتب بھی اس کا اختیار باقی رہے گا، انسانی اختیار مسلوب نہ ہوگا اور نہ جبرسے تبدیل ہوگا۔ اگر یہ کہاجائے کہ انسان کا کفر کرنا اللہ کی مرضی سے ہے تو بھی خود یہ ثابت ہو رہا ہے کہ کفر کافر کا فعلِ اختیاری ہے ورنہ کافر، کافرنہیں ہے''۔

IV. ''انسان کے تمام افعال کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے ان کا صدور انسان سے ہوتاہے اللہ کے خالق ہونے کی وجہ سے بسااوقات افعالِ عباد کی نسبت اللہ کی طرف کردی جاتی ہے ورنہ دراصل وہ بندہ کا فعل ہے''۔[9]

یہی وہ حقائق ہیں جن کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتاہے کہ مولاناروؒ نے اپنے عہدکی نزاکتوں کو سمجھتے ہوئے اس پر کام کیا اور عمومی طور پر اسلام کی تبلیغ واشاعت کا اہتمام۔ اس حوالے سے ڈاکٹر سیدمحمدعبداللہ لکھتے ہیں:"اسلام میں تصوف کے عناصر ابتداء سے ہی موجود چلے آتے ہیں اور گوکہ ابتدائی زمانہ کے صوفی بہت ہی برگزیدہ لوگ تھے اور ان کی تعلیم کسی طرح مذہب اور عملی زندگی کے مخالف نہ تھی مگر رفتہ رفتہ نوافلاطونی خیالات اور بعض دوسرے نظام ہائے فکر کی آمیزش سے، تصوف میں دنیا سے بیزاری کا عنصر، بطور ایک سیاسی عقیدے کے شامل ہوگیا، جس سے توکل، تقدیر، فنا اور ترک دنیاکی طرح کے مسائل کی غلط تعبیر پیدا ہوئی۔ یہ فلسفہ زندگی جس قدر جذبۂ حیات کا قاتل ہے، اسی قدر اسلام کی عملی تعلیم کے منافی بھی ہے۔ مولانا جلال الدین رومی نے خود صوفی ہونے کے باوجود اس طرزِ زندگی بلکہ اس نظریہ زندگی کے خلاف پرزور آواز بلند کی اور توکل، جبر، کسب اور دین ودنیا کے باہمی تعلق پرپیہم اور مسلسل، نہایت مؤثر اور دل نشین پیرائے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا"۔[10]

مذکورہ خیالات کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتاہے کہ مولانا رومؒ کے کلام میں اتنی وسعت اور تازگی ہے کہ یہ ہرزمانے کے سوچنے والے ذہن کو متاثر کرسکتا ہے اس کی ایک زندہ مثال خود علامہ اقبال ہیں: رومی کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے انسان کی روحانی واخلاقی حدود کو اتنا وسیع اور محکم کردیا ہے

کہ مابعد الطبیعی انداز نگاہ بھی اس کے احاطے سے قاصر اور اثبات پر مجبور ہے یہ وصف اقبال کو بھی منتقل ہوا ہے، مگر اس فرق کے ساتھ کہ بنیادی امور مثلاً خودی اور اس کی سب سے بڑی قوت یعنی عشق، رومی کا تجربہ ہے اور اقبال کا نظریہ۔ رومی کے لئے معنی کوئی علامتی اور ذہنی چیز نہیں بلکہ تکمیلِ حال کا نام ہے کیونکہ حقیقت، کسی عقلی اثبات کی نہیں بلکہ وجودی وابستگی کی متقاضی ہے، اس لئے وہ فہم اور شرائطِ فہم کو شعورِ حقیقت کی ماہیت سے متصادم قرار دے کر حقارت سے ردّ کردیتے ہیں۔ ان کا یہ رویہ اپنے اندر عارفانہ تحکم رکھتاہے، عقل اس کی منکر نہیں متمنی ہے، بلاشبہ غیر پیغمبرانہ لڑیچر کی پوری تاریخ میں رومی واحد شخصیت ہیں، جس نے حقائق کو فلسفہ مابعد الطبیعیات، عقل پرستی اور تجربیت کی گرفت سے نکال کر ان تک رسائی کے نئے راستے نکالے ہیں اور شعور کی نئی اساس دریافت کی ہے"۔[11]

اس کا مطلب یہ ہواکہ علامہ اقبالؒ جیسا بیدار ذہن ہی مولانا رومؒ کی باریک بینیوں کو سمجھ سکتاتھا ،یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبالؒ اپنے اشعار میں مولانا رومؒ کو پیرِروم یا مرشدِ روم کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں کہ ''رومی کی مثنوی پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے تمام عقلی علوم سے کماحقہ واقف تھا اور ان سے واقف ہوتے ہوئے بھی ان میں جس قدر حقیقت کا پہلو ہے، اس کو اپناتے ہوئے بھی وہ کسی محدود اور ظنی عقلیت کا شکارنہ تھا بلکہ ہر مسئلہ پر رومی غیرمعمولی بصیرت اور غیرمعمولی جرأت سے تنقید کرتاتھا۔ وہ عقل کو خدا کی ایک عظیم نعمت سمجھتا ہے اور حکمت کا دلدادہ ہے، لیکن اس کے ہاں عقل وحکمت کے دائرے بڑے وسیع ہیں۔ ان کی عقل صرف مادیات اور حیات تک محدود نہیں۔ وہ عقل کو صفات اللہ کا ایک عالمگیرمظہر تصورکرتا ہے چنانچہ کہتاہے:

ع آں چہ دریا ہاست درپہنائے عقل

اس کے نظریہ حیات میں مادے سے لے کر خدا تک زندگی ہی زندگی ہے، لیکن انتہائی پستی سے انتہائی بلندی تک اس کے بہت سے مدارج ہیں۔ ہر درجہ حیات زندگی ہی کا ایک درجہ ہے اور جہاں زندگی ہے وہاں کسی نہ کسی درجے کی عقل بھی ہے۔ چنانچہ عارف رومی عقل جمادی، عقل نباتی، عقل انسانی اور عقل نبوی کے مدارج کا ذکر کرتاہے۔ خدائے حکیم کی خلقت اور مظاہرمیں سے کوئی مظہر حکمت سے خالی نہیں۔ فرق صرف اتناہے کہ جس درجے کا مظہر ہے، اسی درجے کی عقل ہے''۔ [12]

یہی وجہ ہے کہ جب مولانا رومؒ نے اپنا مافی الضمیرمثنوی معنوی کی شکل میں ترتیب دیا تو اس کا فوری اثریہ ہوا کہ آپؒ کے کلام کو ہست قرآن درزبان پہلوی کہا جانے لگا۔''قرآن کے بعدجس کتاب کے ذریعے زمین وآسمان کو تسخیرکرنے والے علوم وحکمت تک رسائی ہوتی ہے وہ مثنوی ہے اور اس میں عصر حاضرکے ان پیچیدہ مسائل کا حل بھی موجود ہے جن سے انسان حواس باختہ ہوکر اپنی تقدیر سے مایوس ہوجاتا ہے''۔یعنی مولانا رومؒ نے اپنے کلام کے ذریعے ایک طرف مسلمانوں کو مایوسی کی کیفیت سے نکالنے کا کام کیا تو دوسری طرف اسلام کے بنیادی عقائد کو ایک نئے انداز میں حکمت ودانائی سے بیان کیا: "مولانا روم کے کلام میں حکمت اور علم کلام کے بڑے بڑے مسائل شعری زبان میں اداہوگئے ہیں۔ صفات باری، نبوت، روح، معاد، جبروقدر، تصوف، توحید، اور علمی موضوعات میں سے تجدد امثال اور مسئلہ ارتقاء جیسے اہم مسائل کی تعبیر موجود ہے"۔ [13]

فاضل مقالہ نگار نے جو علمی موضوعات کی طرف اشارہ کیاہے اس ضمن میں مولانا رومؒ کے کچھ اشعار جوفلسفہ کشش کو ظاہر کرتے ہیں جس کی بنیاد پر کائنات کا نظام قائم ہے۔

جملہ اجزاء جہاں زاں محکم پیش　　جفت جفت وعاشقاں جفت خویش

یعنی: دنیاکے تمام اجزاء جوڑ، جوڑ ہیں۔ اور ہر ایک اپنے جوڑے کا عاشق ہے۔

آسماں گوید، زمیں را مرحبا　　باتوام چوں آہن وآہن رُبا

یعنی: آسمان، زمین کو خوش آمدید کہتاہے۔ کہ میری تیری مثال لوہے اور مقناطیس کی سی ہے۔

اس کے علاوہ ذرّات کی ترکیب سے جو اجسام سامنے آتے ہیں اس کے متعلق مولاناؒ فرماتے ہیں:

میلِ ہرجزئی بہ جزئی می نہد　　زاِتّحادِ ہردو تولیدے جہد

یعنی: ہر جزئی کا ایک جزئی کی طرف میلان ہے۔ دونوں کے اتّحاد سے پیدائش ہوئی ہے۔

مولاناروم تجدّدِ امثال یعنی کائنات کی صورتیں ہرآن تبدیل ہونے کے عمل پرکہتے ہیں:

ہرنفس نومے شود دنیا وما　　بے خبراز نوشدن اندربقا

یعنی: ہر سانس میں دنیا نئی بن رہی ہے۔ ہم اس کے نئے بننے سے بے خبرہیں۔

عمر ہمچو جوئے نونومی رسد　　مُستمِرے می نماید درجسد

یعنی: زندگی نہر کے پانی کی طرح نئی نئی آتی رہتی ہے۔ بدن میں مسلسل نظر آتی ہے۔

شاخِ آتش رابہ جنبانی بساز　　درنظر آتش نماید بس دراز

یعنی: جلتی لکڑی کو تیزی سے گھماؤ۔ تو دیکھنے میں ایک لمبی آگ نظرآئے گی۔ [14]

یعنی انسان ہر لمحے فناوبقاء کے عمل سے گزر رہا ہے اور یہ تبدیلی اتنی سرعت کے ساتھ وقوع پذیر ہورہی ہے کہ بظاہر مستقل اور مستمر محسوس ہوتی ہے۔ جس طرح نہرکے پانی کی سطح جو مسلسل تبدیل ہوتی ہے مگر احساس نہیں ہوتا اور اسی طرح آگ کا وہ دائرہ جو اپنی جگہ تبدیل کررہا ہوتا ہے مگر نگاہِ ظاہر اس کو محسوس نہیں کرتی۔

مختصراً یہ کہ مولانا رومؒ علومِ ظاہری اور علومِ باطنی کا کماحقہ ادراک رکھتے تھے۔ اور ایک عالمِ باعمل کی صورت میں اس کی ابلاغ کے لئے حدالمقدور کوشاں بھی رہے:''مولاناؒ کا حسنِ سلوک، حسنِ معاشرت اور شریعت کی غیرمعمولی پابندی ہی لوگوں کو ان کے در تک کھینچتی تھی۔ مولاناؒ کے دروازے خواص اور مالداروں سے زیادہ عوام اور غریبوں کے لئے کھلے رہتے تھے۔ مولاناؒ کے معتقدین میں جہاں مردوں کے انبوہ درانبوہ نظرآتے ہیں وہاں معتقد عورتوں کی بھی ایک بڑی تعداد ہے۔ سلطان غیاث الدین کی بیگم جو قونیہ سے قیصریہ چلی گئی تھیں، جب مولاناؒ کی جدائی برداشت نہ کرسکیں تو انہوں نے ایک بازنطینی آرٹسٹ سے مولاناؒ کی تصویر بنوائی جس کو وہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیزرکھتی تھیں۔ خود مولاناؒ کی پوتی سلطان ولد کی صاحبزادی ایک عرصہ تک کامیابی کے ساتھ طریقِ مولویت کی نشرواشاعت کرتی رہیں۔ مولاناؒ کی دوسری بیوی کرا خاتون کو بھی وہ روحانی مقام حاصل تھا کہ مولاناؒ ان کو 'سارہ' ثانی اور 'مریمِ زمانہ' کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں''۔ [15]

درج بالا اقتباس میں پروفیسر اینماریاشمیل نے جن واقعات کو بنیاد بناکر مولاناروم کے حسنِ معاشرت کی طرف اشارہ کیا ہے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتاہے کہ مولانا رومؒ حصولِ علم اور حصولِ معرفت کے عمل میں مرد وزن کو یکساں نظرسے دیکھتے تھے اور اس سلسلے میں ان کی بھرپور رہنمائی بھی کرتے تھے۔ تاکہ آنے والے حالات میں مسلمان ایک عالمانہ، مہذبانہ، مودبانہ اور عادلانہ نظام سے مزین گھروں سے تربیت یافتہ ہوں

مولانا رومؒ نے محبت کو موضوعِ بحث بناکر اس کا پورا حق ادا کیاہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے کیا خوب کہاہے۔ جب کوئی عاشق ''محبت کی کیفیت بیان کرنا چاہتاہے تو مادی اشیاسے تشبیہیں ڈھونڈتاہے، کبھی اس کو آنکھوں کی ٹھنڈک کہتاہے اور کبھی اس کو آگ سے تشبیہ دیتاہے:

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ　　اک آگ سی ہے سینے کے اندرلگی ہوئی

صوفی کہتاہے کہ عشق ایک آگ ہے جو ماسوا اللہ سب چیزوں کو جلاکر بھسم کردیتی ہے''۔ [16]

یعنی مولانا رومؒ نے نہایت حکمت ودانائی کے ساتھ عشقِ مجازی کے جملہ خوبصورتی کی بنیادوں پر نہ صرف کاری ضرب لگائی ہے بلکہ اس کی تمام تر خوبصورتی کو عشقِ حقیقی کی طرف منتقل کیاہے۔مثلاً

بے غرض نبود بگردش درجہاں　　غیرِ جسم وغیرِ جانِ عاشقاں

یعنی: دنیا میں گردش بے غرض نہیں ہوتی۔ سوائے عاشقوں کے جسم اور جان کے۔

عاشقانِ کُل نہ ایں عُشّاقِ جُزو ماند از کُل آنکہ شد مُشتاقِ جُزو

یعنی: کُل کے عاشق، نہ کہ یہ جزو کے عاشق۔ جو جزو کا عاشق ہوا وہ کُل سے (دور) رہ گیا۔

چونکہ جُزوے عاشقِ جُزوے شود زُود معشوقش بکُلِّ خود رود

یعنی: جب کوئی جزو، کسی جزو کا عاشق ہو۔ اس کا معشوق بہت جلد اپنے کل کی طرف چلا جاتاہے۔[17]

اے خدائے باعطاوباوفا رحم کن برعمررفتہ برجفا

یعنی: اے اللہ آپ باعطا بھی ہیں اور باوفا بھی ہیں۔ اے اللہ ہماری جفاؤں پر اور ہمارے گناہوں پر رحم فرما

اب سوال ہوتاہے کہ عطاکو وفاسے کیا نسبت ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ ہر عطا کا سبب وفااور محبت ہے۔ حق تعالیٰ کے جو بے پایاں عطاوانعامات ہیں ان کا سبب اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں کے ساتھ محبت ہے اور دنیاکے جتنے باعطا لوگ ہیں کسی مرحلہ پر وہ وفاسے مجبور اور عطا سے معذور ہوجاتے ہیں مثلاً کسی کا گہرا دوست مقروض ہوگیا اور وہ چاہتا ہے کہ اپنے دوست کی مدد کرے لیکن اس کے پاس اتنا پیسہ نہیں کہ اس کا قرض ادا کرسکے۔یہ شخص باوفا ہونے کے باوجود باعطا ہونے پر قادرنہیں، وفاسے مجبور اورعطاسے معذور ہوگیا۔[18] مولانا رومؒ راہِ عمل کے لئے نئی راہیں اور نئے ضابطے تراشتے ہیں وہ زندگی سے فرار نہیں ،بلکہ اس سے شناسائی بڑھانے پر زور دیتے ہیں اُن کا کہناہے۔ آپ وہی کچھ ہیں یعنی

عشق کا دریائے ناپیدکراں جیسی خواہش ویسی سوچ

یعنی: جیسی سوچ ویسی کامیابی جیسی کامیابی ویسی ہی تقدیر

محبت کی پرستاری کیوں ضروری ہے؟ محبت انسانی ذہن میں روشنی پیدا کرتی ہے اور ذہن اس روشنی کی موجودگی میں وسعت پذیر ہوتا ہے اور اس کی تخلیقی قوت میں اضافہ ہوتاہے ،لیکن اس سے اہم نکتہ یہ ہے کہ محبت دوپُر اثر منفی قوتوں یعنی پندار اور تشکیک سے ذہن کو صاف کرتی ہے۔ ان منفی قوتوں کی موجودگی میں آپ نہ تو نئے خیالات کو تسلیم کرتے ہیں اور نہ ہی ذہنی ارتقاء کے ساتھ ہم آہنگ ہوتے ہیں، یوں آپ علم کی اتھاہ گہرائی کو نہیں چھوپاتے۔ اس طرح یہ منفی قوتیں سوچ، خواہش، کامیابی اور تقدیر کے لئے رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ اسی بناء پر رومی پکارتاہے۔

ہر جانب تمہارا پیار ہی پیار ہے چہار سوگلابوں کی مہک ہی مہک ہے

میرے خوں کا ہر قطرہ پکار رہاہے اپنی محبت کے رنگ میں رنگ دو

مجھے اپنی شفقت سے توانا کردو [19]

مولانارمؒ ''شریعت کو جو تہذیب وریاضتِ نفس کا ذریعہ ہے خاص اہمیت دیتے ہیں۔ نہ وہ ترک شریعت کی نصیحت کرتے ہیں اور نہ ہی صوفیا کی بے اعتدالیوں کو اپنانے کی اور نہ ہی وہ فقروعزلت اور رہبانیت کے رجحانات کی تبلیغ کرتے ہیں۔ مرد کامل ان کی نظرمیں وہ ہے جو صورت وسیرت دونوں لحاظ سے کامل ہو۔ اور زندگی کے حسن اور رعنائیوں سے خود کو محروم نہ کرے اور اپنے آپ کو ایک ہی دفعہ خشک زہد کے لئے وقف نہ کردے۔ وہ اہل وعیال کو بھی حجاب راہ نہیں سمجھتے اور ایک اہل کلام کی طرح تمثیلی قیاسات اور شاعرانہ تشبیہات کے ذریعہ قرآنی تعلیمات اور اہل شریعت کی تائید واثبات میں کوشاں نظرآتے ہیں۔ وہ مختلف مسائل مثلاً توحیدکی حقیقت، روح کی واقعیت، حشرونشرکی کیفیت اور جبر و اختیار کے حدود کی اہل شریعت کے نظریے کے مطابق توجیہہ کرتے ہیں۔ اس کے باوجود عشق کو طریقت وشریعت کا جوہر سمجھتے ہیں اور تہذیب نفس میں محبت کو جو دل کی تربیت وتزکیہ کا سبب ہے مؤثر ترین عامل خیال کرتے ہیں۔ وہ عشق کو معراج روح کا بہترین ذریعہ سمجھتے ہیں جو کشف حقیقت تک رسائی کے لئے اہل طریقت کی اصل غرض وغایت ہے''۔[20]

مذکورہ تمام باتوں کی روشنی میں ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مولانا رومؒ بنیادی طور پر نہ صرف ایک صوفی، شاعر یا مولوی طبیعت کے انسان تھے بلکہ ایک عالمِ باعمل، متقی اور نہایت زیرک اور

بیدار ذہن کے مالک صوفی شاعر تھے۔ آپؒ اپنے عہدکے حالات سے بھی واقف تھے اور آنے والے وقتوں میں مسلمانوں کو جن علمی اور فکری بنیادوں پر اغیارسے مقابلہ ہوگا ان کے سدِّباب کے لئے آپؒ نے مختلف جہتوں پر کام کیا۔ اس بات کو اگر ہم یوں سمجھنا چاہیے کہ کسی بھی چشمے سے نکلنے والا پانی صاف وشفاف ہوتاہے۔ یہی پانی جب آگے بڑھ کر کسی نہر سے گزرتا ہے تو اس میں آلودگی کے امکانات پیدا ہوجاتے ہیں اور اس آلودگی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک محسوس اور دوسرے غیرمحسوس۔ محسوس آلودگی کی مثال مٹی اور کیچڑ ہے یا پھر بھیڑ بکریوں کی وہ گندگی ہے جو اس کی گذرگاہ میں شامل ہوکر پانی کی رنگت بدل دیتی ہے۔ یہ محسوس آلودگی ہے۔ ممکن ہے اس میں غیرمحسوس آلودگی بھی شامل ہو۔ یعنی دیکھنے میں پانی صاف ستھرا اور چشمے سے نکلنے والے پانی کی طرح شفاف ہو، مگر کوئی ایسا آدمی اس میں غوطہ لگا کر نکلا ہو جو کسی وبائی مرض میں گرفتار ہو،اور اطراف کے رہنے والے لوگ اس پانی کے استعمال سے بیمار ہوجائیں۔ اگرچہ ظاہراً اس پانی میں کوئی آلودگی دکھائی نہ دے مگر اس میں ایسے جراثیم داخل ہوجاتے ہیں جنہیں صرف مسلّح آنکھوں ہی سے دیکھا جا سکتا ہے لیکن پھربھی ممکن ہے اس کے مقابل ایسے آلات اور وسائل ہوں جو پانی کی اس گندگی کو دور کردیتے ہوں۔

بالکل اسی طرح معنوی امور کی کیفیت ہے۔ یعنی ایک معنوی سرچشمہ ہے جو ابتدائی آفرینش ہی سے پاک صاف ہے اور اس میں کسی قسم کی کوئی آلودگی نہیں مگر بتدریج اس کا گذر اغیار کے افکار کی گذرگاہوں سے ہوتاہے اور وہاں نسلیں اسے بعد کے ادوار میں منتقل کرتی رہتی ہیں اور یہیں سے اس میں ایک محسوس یا پھر غیرمحسوس آلودگی کے امکانات پیدا ہوتے ہیں۔ محسوس آلودگی کو انسان اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے جب کہ غیرمحسوس آلودگی صرف علماء یعنی خوردبینی آلات کے حامل افراد ہی کو نظرآتے ہیں اس لحاظ سے مولانا رومؒ نے اپنے عہد میں ان فکری آلودگیوں کو دور کرنے کے لئے بھرپور جدوجہد کی۔ یہی وجہ ہے کہ آپؒ کے بعد اس علمی اور فکری تحریک کو آنے والی صدیوں میں مسلمان فلاسفر، صوفیائے کرام ، شعرائے کرام اور علمائے کرام نے جلابخشی۔ یعنی ساتھویں صدی ہجری کو شروع ہونے والی تحریک جب چودھویں صدی ہجری تک پہنچی تو علامہ اقبالؒ بے ساختہ یہ کہہ اٹھے۔

غلط نگرہے تری چشم نیم باز اب تک — تراوجود تیرے واسطے ہے راز اب تک
ترا نیاز نہیں آشنائے ناز اب تک — کہ ہے قیام سے خالی تری نماز اب تک
گستہ تارہے تیری خودی کا ساز اب تک — کہ توہے نغمہ رومی سے بے نیاز اب تک [21]

*****

حوالہ جات

1۔ریحان احمد، یوسفی، عروج وزوال کا قانون اور پاکستان(لاہور، دارالتذکیر، 2003ء) 19۔
2۔ بشیراحمد، ڈار، اقبال اور رومی ہمارے مسائل اور ان کا حل،پیرورومی ومریدہندی،"مولانا رومؒ اور علامہ اقبال کا تقابلی مطالعہ" مرتبہ محمداکرام چغتائی (لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، 2004) 19۔
3۔ناعمہ، صہیب، تاریخ اسلام کی عظیم شخصیات(کراچی، فضلی بک سپرمارکیٹ، 2005ء) 464۔
4۔ ڈاکٹر، خلیفہ عبدالحکیم، مولاناروم اور اقبال،پیرورومی ومریدہندی " مولانا رومؒ اور علامہ اقبال کا تقابلی مطالعہ" مرتبہ محمداکرام چغتائی(لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز،2004ء) 9۔
5۔ بشیراحمد، ڈار، اقبال اور رومی ہمارے مسائل اور ان کا حل، پیرورومی ومریدہندی " مولانا رومؒ اور علامہ اقبال کا تقابلی مطالعہ" مرتبہ محمداکرام چغتائی(لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز،2004ء) 20۔
6۔ علامہ، شبلی نعمانی، شعرالعجم، ج5(اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن ، 1918ء) 119- 120۔
7۔مولانا، قاضی سجاد حسین مترجم، مثنوی مولوی معنوی، دفتراول(لاہور، حامداینڈکمپنی، 1976ء) 14۔
8۔ مولانا، قاضی سجاد حسین مترجم، مثنوی مولوی معنوی، دفتراول(لاہور، حامداینڈکمپنی،1976ء) 17۔
9۔ مولانا، قاضی سجاد حسین مترجم، مثنوی مولوی معنوی، دفتراول(لاہور، حامداینڈکمپنی،1976ء) 19۔

10۔ ڈاکٹر، سیدمحمدعبداللہ، اقبال اور رومی، پیرِرومی ومریدہندی " مولانا رومؒ اور علامہ اقبال کا تقابلی مطالعہ" مرتبہ محمداکرام چغتائی(لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، 2004ء) 82۔
11۔احمد، جاوید، رومی، پیرِ رومی ومریدِ ہندی"مولانا رومؒ اور علامہ اقبال کا تقابلی مطالعہ"(لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، 2004ء) 354۔
12۔ ڈاکٹر، خلیفہ عبدالحکیم، مولاناروم اور اقبال، پیرِرومی ومریدہندی " مولانا رومؒ اور علامہ اقبال کا تقابلی مطالعہ "مرتبہ محمداکرام چغتائی(لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، 2004ء) 10-
13۔ اردودائرہ معارف اسلامیہ،(لاہور، دانش گاہ پنجاب، 1973ء) 326۔
14۔مولانا، قاضی سجاد حسین مترجم، مثنوی مولوی معنوی، دفتراول(لاہور، حامداینڈکمپنی، 1976ء) 20=21۔
15مولانا، قاضی سجاد حسین مترجم، مثنوی مولوی معنوی، پروفیسراینماریاشمیل کامقالے سے مآخوذ، دفتردوم(لاہور، حامداینڈکمپنی، 1976ء) 7-
16ڈاکٹر، خلیفہ عبدالحکیم، تشبیہاتِ رومی(لاہور، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ،1990ء) 3۔
17۔ مولانا، قاضی سجاد حسین مترجم،مثنوی مولوی معنوی، دفتراول(لاہور، حامداینڈکمپنی، 1976ء) 295-296۔
18مولانا، شاہ حکیم محمداختر، فغانِ رومی (کراچی، کتب خانہ مظہری،2000ء) 1-9۔
19ظفر، عظیم، رومی کے نغمے: شخصیت فکراور اندازِ سخن کا مطالعہ(...، لبرٹی بکس پاکستان،2002ء) 181-183۔
20ڈاکٹر، عبدالحسین زرین کوب،ازگلستان عجم،ڈاکٹرمہرنورمحمدخان،ڈاکٹرکلثوم فاطمہ مترجمین(اسلام آباد، مرکزتحقیقات فارسی ایران وپاکستان، 1985ء) 170-171۔
21۔علامہ اقبال، ضرب کلیم(اردو(، www.allamaiqbal.com

کتابیات

1) یوسفی،ریحان احمد، عروج وزوال کا قانون اور پاکستان، لاہور، دارالتذکیر، 2003ء۔
2) ڈار،بشیراحمد، اقبال اور رومی ہمارے مسائل اور ان کا حل،پیرِرومی ومریدہندی،"مولانا رومؒ اور علامہ اقبال کا تقابلی مطالعہ" ،لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، 2004ء۔
3) صہیب،ناعمہ، تاریخِ اسلام کی عظیم شخصیات(کراچی، فضلی بک سپرمارکیٹ، 2005ء) 464۔
4) خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر،مولاناروم اور اقبال،پیرِرومی ومریدہندی " مولانا رومؒ اور علامہ اقبال کا تقابلی مطالعہ" ،لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز،2004ء۔
5) شبلی نعمانی، علامہ، شعرالعجم،اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن ، 1918ء۔
6) قاضی سجاد حسین، مولانا، مثنوی مولوی معنوی، لاہور، حامداینڈکمپنی، 1976ء۔
7) سیدمحمدعبداللہ،ڈاکٹر، اقبال اور رومی، پیرِرومی ومریدہندی " مولانا رومؒ اور علامہ اقبال کا تقابلی مطالعہ" ، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، 2004ء۔
8) جاوید، احمد، رومی، پیرِ رومی ومریدِ ہندی"مولانا رومؒ اور علامہ اقبال کا تقابلی مطالعہ"، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، 2004ء۔
9) اردودائرہ معارف اسلامیہ،لاہور، دانش گاہ پنجاب، 1973ء۔
10) قاضی سجاد حسین مترجم، مولانا، مثنوی مولوی معنوی، پروفیسراینماریاشمیل کامقالے سے مآخوذ،لاہور، حامداینڈکمپنی، 1976ء۔
11) خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر، تشبیہاتِ رومی، لاہور، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ،1990ء۔
12) شاہ حکیم محمداختر، مولانا، فغانِ رومی ،کراچی، کتب خانہ مظہری،2000ء۔
13) عظیم، ظفر، رومی کے نغمے: شخصیت فکراور اندازِ سخن کا مطالعہ،...، لبرٹی بکس پاکستان،2002ء۔
14) عبدالحسین زرین کوب، ڈاکٹر، ازگلستان عجم، اسلام آباد، مرکزتحقیقات فارسی ایران وپاکستان، 1985ء۔